(انتقاد کے لئے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے)

انتقاد

"جدید ہندوستان میں مسلم سیاست"

جدید ہندوستان میں مسلم سیاست (MUSLIM POLITICS IN MODERN INDIA) ڈاکٹر مشیر الحق کے اس مقالہ کا عنوان ہے جو انھوں نے ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹریٹ کے لئے میکگل یونیورسٹی (کناڈا) میں پیش کیا تھا۔ حال ہی میں یہ مقالہ کتابی شکل میں مینا کشی پرکاشن، میرٹھ (ہندوستان) سے شائع ہوا ہے۔

کتاب کے نام سے شبہ ہوتا ہے کہ اس میں ہندوستان بعد از تقسیم کی مسلم سیاست کا جائزہ لیا گیا ہوگا لیکن کتاب کے نام کے ساتھ ہی سنین کا ذکر کر کے اس جائزہ کو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک محدود کر دیا گیا ہے لہذا اسی پس منظر میں اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اس کتاب میں موجودہ صدی کی ہندوستانی مسلم سیاست میں مذہب کے کردار اور مسلمانوں کے سیاسیات میں زیادہ غیر مذہبی رویّہ (SECULARIST ATTITUDE) اختیار کرنے کی ناکام مساعی سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد اس پورے مذہبی سیاسی ڈراما کے اہم کردار ہیں کیونکہ الہلال اور پھر البلاغ کے ذریعہ انھیں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو سیاست میں دلچسپی لینے پر آمادہ کیا ورنہ اس سے پہلے مسلمانوں کے لئے سیاست شجر ممنوعہ تھی۔ مولانا آزاد سے پہلے مسلمانوں کے دو گروہ تھے، ایک سرسیّد احمد خان کے زیر اثر جو حکومت برطانیہ سے کسی قسم کی ٹکر لینے کے خلاف تھا۔ دوسرا گروہ علماء کے زیر اثر تھا جو اس وقت تک حالات پر قانع رہنا چاہتا تھا۔ جب تک اسے مذہبی آزادی میسر رہے لیکن سب سے پہلے آزاد نے یہ درس دیا کہ سیاسی آزادی کے بغیر مذہبی آزادی بے معنی ہے۔ اس درس سیاست کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے محسوس کیا کہ جب تک علماء اپنے گوشۂ عزلت سے

باہر نہیں آئیں گے اس وقت تک مسلمان اس جدوجہد میں دل وجان سے حصّہ نہیں لیں گے۔ مولانا اپنی تحریک میں کامیاب ہوگئے۔ علماء اپنی روایت توڑ کر سیاست کے میدان میں آگئے اور اسی دن سے سیاست بندی مسلمانوں کا مذہبی فریضہ بن گئی۔

یہ سمجھے بغیر کہ وہ کیا کر رہے ہیں، علماء اپنے ساتھ مذہب کا بیج لائے جسے وہ سیاست کے میدان میں بو کر دُعا کرنے لگے کہ اس سے متحدہ ہندوستان کا پودا برآمد ہوگا۔ برآمد تو کچھ ضرور ہوا لیکن وہ متحدہ ہندوستان نہیں بلکہ پاکستان تھا اور یہ اس عمل کا قدرتی نتیجہ تھا جو قوم پرست (NATIONALIST) علماء نے نادانستہ کیا تھا اور مولانا آزاد اپنی بصیرت، ذہنی توانائی اور سیاسی قوت رکھتے ہوئے ان حالات کے خاموش تماشائی بنے رہے۔

مولانا آزاد اور مسٹر جناح (قائداعظم) کا مقابلہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ خاندان، تربیت اور مزاج کے لحاظ سے دیندار ہونے کے باوجود مسٹر جناح نے مذہبی فرقہ واریت کی حمایت کا فیصلہ کیا اور پورے زور وشور سے اپنے نظریہ کو پیش کر دیا اس کے برعکس خاندانی، علمی اور معاشرتی لحاظ سے ایک مذہبی شخص ہونے کے باوجود مولانا آزاد نے اگرچہ اپنی منزل تو لامذہبیت (SECULARISM) کو بنایا مگر وہ لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی بات کہنے کی جراءت نہ کر سکے اور اپنے لامذہبی نظریہ کے سلسلہ میں مذہب کو ایک بار آخری دلیل کے طور پر پیش کر کے پھر وہ اس سے چھٹکارا نہ پا سکے نہ علماء کو جنھیں وہ خود ہی سیاست میں کھینچ کر لائے تھے، دوبارہ سیاست سے نکال سکے۔

مصنف کے تجزیہ کے مطابق پاکستان کا قیام بظاہر قوم پرست علماء کی شکست معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں بلکہ یہ علماء خود اپنے خلاف کامیاب ہوگئے۔ یعنی اپنے مقصد میں انھیں ناکامی ضرور ہوئی لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو ذرائع انھوں نے اپنائے تھے وہ کامیاب ہوگئے گویا جو بیج انھوں نے بویا تھا اس کے پھل سے ان کے حریفوں نے فائدہ اُٹھایا۔ اس اجمال کی تفصیل مصنف نے اصل کتاب کے ان ابواب میں بیان کی ہے جو قوم اور قومیت کے مسئلہ سے متعلق ہیں۔

مصنف کا خیال ہے کہ "قوم" اور "قومیت" کے الفاظ میں پیچیدگی اس لئے ہوئی کہ انھیں سیاسی سطح پر انگریزی الفاظ (NATION) اور نیشنلزم (NATIONALISM) کے مترادفات کے طور پر استعمال کیا جانے لگا حالانکہ درحقیقت اُردو میں انگریزی لفظ "نیشن" کا بالکل صحیح مترادف لفظ

کوئی ہے ہی نہیں کیونکہ" قوم " ایک مختلف المعانی لفظ ہے جس کا تعین سیاق و سباق کے بغیر نہیں کیا جاسکتا مثلاً (الف) ایک مذہبی فرقہ (COMMUNITY) کے معنوں میں جیسے ہندو قوم، مسلم قوم (ب) پیشہ ورانہ گروہ کے معنوں میں جیسے جلاہوں کی قوم، لوہاروں کی قوم اور (ج) برادری کے معنوں میں جیسے برہمنوں کی قوم، وغیرہ۔ مصنف نے سرسیّد احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی کے بہت سے اقتباسات دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ انھوں نے قوم اور قومیت کے الفاظ کو مختلف اوقات میں مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے اور بالآخر یہی لفظ" قوم" تھا جو مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کے درمیان مابہ النزاع بنا۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبی است

اور جب بات یہاں تک پہنچی تو مولانا حسین احمد نے" قوم" اور" ملّت" کے فرق کا سہارا لیا لیکن یہی لفظ قوم تھا جو استعمال ہوتے ہوتے قوم پرست علماء کی خواہشوں کے برعکس دو قومی نظریہ پر منتج ہوا اور پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔

یہ ہے اس کتاب کا مرکزی خیال، ضروری نہیں کہ اس سے اتفاق کیا جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے خلاف بہت کچھ کہا جاسکتا ہے کیونکہ مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانی مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت بدلائل اس امر پر متفق اور مطمئن ہے کہ پاکستان علماء کی مذہبی آواز کے نتیجہ میں حادثاتی یا بالفاظ دیگر منفی طور پر وجود میں نہیں آیا بلکہ مذہبی، سیاسی اور ثقافتی بنیادوں پر برصغیر کے مسلمانوں کے ایک مثبت فیصلہ اور شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن دراصل اس مقام پر یہ بحث نہ ضروری ہے اور نہ مناسب۔ بہرحال اس کتاب میں چند مشہور واقعات پر جو دلچسپ تنقید کی گئی ہے وہ یقیناً مزید تحقیق اور تلاش و جستجو کی متقاضی ہے اور اسی مقصد کے پیش نظر انھیں یہاں مختصراً بیان کیا جارہا ہے۔

مشہور ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برصغیر کے علماء نے نمایاں حصّہ لیا تھا لیکن مصنف اس خیال سے متفق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس غلط فہمی کی ایک بڑی وجہ اس وقت کے انگریز افسروں کی لفظ "عالم" سے لاعلمی تھی۔ انھوں نے ہر اس شخص کو عالم سمجھ لیا جس نے مذہب کا نام لے کر علمِ بغاوت بلند کیا۔ مثال کے طور پر یوپی میں بغاوت کے سلسلہ میں انگریز افسروں نے چھبیس" مولویوں" کے نام گنوائے ہیں جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لیا۔ ان چھبیس مولویوں (علماء)

کے نام اس سرکاری ریکارڈ میں موجود ہیں جو یوپی کی حد تک بغاوت سے متعلق ہے۔ یہ ریکارڈ چھ جلدوں میں یوپی کی حکومت نے ۱۹۶۱ء میں یوپی میں جدوجہد آزادی: سرچشمۂ مواد (FREEDOM STRUGGLE IN UTTAR PRADESH: SOURCE MATERIAL) کے نام سے شائع کردیا ہے۔ ان چھبیس علماء میں صرف پانچ ایسے ہیں جنھیں رحمٰن علی نے "تذکرہ علماء ہند" میں شامل کیا ہے۔ لیکن دراصل یہ پانچ بھی تحریک میں شامل نہیں تھے۔ مثلاً ان میں ایک شاہ اسمٰعیل شہید غدر سے برسوں پہلے شہادت پا چکے تھے مگر "رسالۂ جہاد" کے مصنف کے طور پر ان کا نام ریکارڈ میں آگیا۔ دوسرے تین علماء مولانا فضل رسول بدایونی، مفتی صدرالدّین اور مولانا فضل حق خیرآبادی تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھے جن سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے باغیوں کا ساتھ دیا ہوگا۔ مولانا فضل حق کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا لیکن مصنف کے نزدیک یہ بات سراسر مشتبہ ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے ایک غیر مطبوعہ مقالہ (INDIAN MUSLIMS' ATTITUDE TO THE BRITISH IN THE EARLY 19th CENTURY: A CASE STUDY OF SHAH ABDUL AZIZ) کے علاوہ جو ۱۹۶۴ء میں میکگل یونیورسٹی کے شعبہ تعلیماتِ اسلامی کے لئے لکھا گیا "یوپی میں جدوجہد آزادی: سرچشمۂ مواد" کے حوالے دیئے ہیں۔ اس کتاب کی جلد پنجم کے صفحہ ۱۰۸ پر ان صاحب کو مولانا فضل حق خیرآبادی کے نام سے پیش کیا گیا ہے لیکن جلد دوم کے صفحات ۵۱۷ اور ۵۶۵ پر، جلد سوم کے صفحہ ۶۷۶ پر اور جلد پنجم کے صفحہ ۴۳۸ پر یہ وضاحت کی گئی ہے کہ یہ "مولوی فضل حق" یا "فضل حق" ان صاحب سے مختلف ہیں، جو "مولانا فضل حق خیرآبادی" کے نام سے مشہور ہیں۔ اب رہے پانچویں عالم یعنی "عالم علی" تو ان کے بارے میں مصنف نے "یوپی میں جدوجہد..." جلد پنجم صفحہ ۳۲۹ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ بغاوت میں حصہ لینا تو ایک طرف انھوں نے تو بہت سے انگریزوں کو پناہ دے کر باغی رہنما بخت خان کو ناراض کرلیا تھا۔

علماء اور غیر علماء کے درمیان انگریز افسروں کے اسی فرق نہ کرنے کا ایک اور دلچسپ نتیجہ نکلا یعنی مصنف کے خیال کے مطابق اس صدی کے پہلے دو عشروں تک کسی کو اس بات سے دلچسپی نہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں علماء نے حصہ لیا تھا یا نہیں اور نہ کبھی علماء ہی نے اس سعادت میں حصہ لینے کا دعویٰ کیا تھا لیکن ۱۹۱۹ء میں جب انھوں نے جمعیۃ العلماء ہند کے نام سے ایک سیاسی، مذہبی تنظیم قائم کی تو

انھیں اس دعویٰ کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ انھیں سیاست میں نووارد نہ سمجھا جائے۔ اس طرح بیسویں صدی کے علماء نے یہ دعویٰ کرنا شروع کیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ان کے اسلاف نے عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے حاجی امداد اللہ مرحوم اور ان کے دو مرید مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے نام لیئے اور یہ کہا جانے لگا کہ ضلع مظفر نگر کی تحصیل شاملی ان کی جدو جہد کا مرکز تھی اور اس جدو جہد میں حاجی امداد اللہ جہادیوں کے امام یا امیر اور مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد بالترتیب سالارِ فوج اور قاضی تھے۔ اور ان کے ایک ساتھی اور صوفی بزرگ حافظ ضامن جو ان کی فوج میں ایک کمانڈر تھے، جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس قسم کا بیان اب تقریباً تمام کتابوں اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کی تصنیفات میں موجود ہے لیکن یہ بیان بعد کی اختراع ہے حقیقت یہ ہے کہ باغیوں کا ساتھ دینے یا خود بغاوت کرنے کی بجائے ان علماء نے قصبہ میں نظم و ضبط قائم کرنے کی کوشش کر کے اصلاً حکومت برطانیہ کا ساتھ دیا تھا لیکن جب انگریزوں کی حکومت دوبارہ مستحکم ہو گئی تو باغیوں ہی کے گروہ نے اپنی جان بچانے کے لئے ان تین حضرات کے خلاف گورنمنٹ میں جھوٹی رپورٹ کر دی۔ چونکہ یہ علماء قانونی معاملات میں ناتجربہ کار تھے اور اپنی صفائی کی خاطر ان کے پاس عدالت میں پانی کی طرح بہانے کے لئے روپیہ نہیں تھا لہٰذا انھوں نے خود کو خدا کے مہربان ہاتھوں میں چھوڑ دیا اور اس سے جو ہدایتیں ملتیں ان پر عمل کرتے رہے۔

مصنف نے اپنے موقف کی بنیاد بطور خاص تین کتابوں پر رکھی ہے۔ پہلی کتاب مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ایک سوانح حیات (سوانح عمری سیدنا الامام الکبیر حضرت شمس الاسلام مولانا محمد قاسم) ہے جسے ان کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد ان کے ایک عزیز دوست مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے لکھی اور جو پہلی بار مطبع صادق الانوار، بہاول پور (مغربی پاکستان) سے شائع ہوئی۔ اب یہ رسالہ مولانا قاسم کی اس مبسوط سوانح عمری کے ایک جز کے طور پر دوبارہ شائع ہو چکا ہے جسے مولانا مناظر احسن گیلانی نے ترتیب دیا ہے۔ یہ سوانح (سوانح قاسمی) ۱۹۵۳ء میں دیوبند سے شائع ہوئی۔ دوسری کتاب جو اس سوانح عمری کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد شائع ہوئی مولانا رشید احمد گنگوہی کی سوانح حیات (تذکرۃ الرشید) ہے جو ان کے ایک شاگرد عاشق الٰہی نے ۱۹۰۸ء میں شائع کی تھی۔ ان دونوں کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ یہ حضرات فسادات سے کوسوں دُور تھے۔ تیسری کتاب جس پر مصنف نے اپنے موقف کی

بنیاد رکھی ہے وہ یوپی کا مذکورہ سرکاری ریکارڈ ہے۔ اس میں تھانہ بھون اور شاملی کے واقعات کی پوری تفصیل موجود ہے۔

جگہ کی قلت کے باعث یہ ممکن نہیں کہ ہم یہاں مصنف کے تمام دلائل اور حوالہ جات کو تفصیل سے سامنے پیش کریں لیکن موضوع کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی اگلی اشاعت میں کتاب کے متعلقہ باب کا مکمل ترجمہ پیش کر دیں گے (انشاء اللہ) تاکہ پاکستان کے مؤرخین و ناقدین اور خصوصاً حلقۂ دیوبند سے منسلک حضرات جو علمی تحقیق و جستجو کے میدان میں سرگرم عمل ہیں اس موضوع پر تنقید کر سکیں۔

ڈاکٹر مشیر الحق کی اس کتاب میں دوسری دلچسپ بحث مولانا آزاد کی ذات اور ان کے اسلاف سے متعلق ہے مولانا کے خاندان کی شہرت کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے اور جن لوگوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مولانا کی معیت میں گزارا ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں بطور خاص بہت کچھ لکھا ہے لیکن ڈاکٹر مشیر الحق کے خیال میں مولانا کی ابتدائی زندگی اور ان کے اجداد کی زندگی اب تک گمنامی کے پردہ میں مستور ہے۔

مولانا کی سوانح لکھنے کی پہلی کوشش مرزا فضل الدین احمد نے کی۔ مولانا جن دنوں رانچی میں نظر بند تھے مرزا صاحب خود رانچی آئے اور اس طریقہ سے مولانا کی مشہور کتاب 'تذکرہ' منصہ شہود پر آئی لیکن جہاں تک ابتدائی زندگی کا تعلق ہے، مرزا صاحب کے بیان کے مطابق مولانا نے اپنے روحانی کمالات کا ذکر کر کے خود کو شاعرانہ استعارات کے ایسے خوب صورت پردوں میں چھپا لیا کہ ان کی طبعی زندگی ایک غیر ضروری تفصیل بن کر رہ گئی۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۶ء میں بالترتیب مہادیو ڈسائی اور اے۔ بی راجپوت کی تصنیف شدہ سوانح عمریاں سامنے آئیں لیکن مولانا کی ابتدائی زندگی کے بارے میں یہ کتابیں بھی کوئی مستند تفصیل نہیں پیش کرتیں۔ مصنف کے بیان کے مطابق مولانا کی سب سے مستند سوانح مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" ہے۔ یہ کتاب ملیح آبادی کے بیان کے مطابق لفظ بلفظ مولانا آزاد کی املا کرائی ہوئی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ املا ۱۹۲۱ء میں کرایا گیا تھا اور کتاب پہلی بار مولانا کے انتقال کے بعد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس تاخیر کا باعث ملیح آبادی نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر نظر ثانی کے لئے مسوّدہ مولانا کو دے دیا جاتا تو وہ پھر کبھی واپس نہ کرتے کیونکہ یہی ان کی عادت تھی۔ دوسری کتاب جو "آزاد کی کہانی . . ." ہی جتنی مستند ہے، ہمایوں کبیر کی "ہندوستان آزاد ہو گیا" (INDIA WINS FREEDOM) ہے۔ اس کتاب کو بھی جو مولانا کے انتقال کے بعد ہی شائع

ہوئی۔ ہمایوں کبیر کے بیان کے مطابق مولانا آزاد نے اُردو میں املا کرایا تھا۔ ہمایوں کبیر نے اسے صرف انگریزی میں منتقل کر دیا تھا۔ لیکن اس کتاب میں مولانا کی نجی زندگی کی کوئی تفصیل نہیں ملتی کیونکہ "مولانا نے ذاتی مسائل پر گفتگو کرنے سے مسلسل انکار کیا۔"

بہر حال مولانا کے اسلاف اور خود ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں چند مشہور واقعات پر ڈاکٹر مشیر الحق نے گرفت کی ہے اور وہی اس وقت ہمارا موضوع گفتگو ہے۔ "آزاد کی کہانی ....." اور دوسری تمام کتابوں میں یہ تفصیلات ملتی ہیں کہ مولانا کے جد امجد شیخ جمال الدین المعروف بہ بہلول دہلوی تھے جو مغلوں کے ابتدائی عہد میں ایک مشہور صوفی عالم تھے۔ بہلول کے بعد نسب میں چند اور نام درج کرنے کے بعد ملیح آبادی مولانا منور الدین کا تعارف کرواتے ہیں جو مولانا آزاد کے والد کے نانا تھے۔ مولانا منوّر الدین، قاضی سراج الدین کے بیٹے تھے جو صوبہ پنجاب کے قاضی القضاۃ بتائے جاتے ہیں۔ مولانا منوّر الدین کی پیدائش ۱۷۸۷ء کے لگ بھگ ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ اپنے وطن قصور (پنجاب) سے دہلی چلے گئے۔ ۱۸۰۹ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ گھر والوں کو بھی دہلی لے گئے تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا منوّر الدین نے اپنا مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ وہ اس قدر مشہور ہوئے کہ مغل سلطنت میں رکن المدرسین مقرر ہو گئے۔ ملیح آبادی کی کتاب کے مطابق یہ تقرری شاہ عالم ثانی کے آخری دور میں ہوئی۔ یہاں ڈاکٹر مشیر الحق یہ کہتے ہیں کہ شاہ عالم ثانی کا انتقال ۱۹۰۶ء میں ہوا جب مولانا منور الدین کی عمر سولہ سال تھی اور ابھی وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

مولانا آزاد کے سوانح نگاروں نے مولانا منوّر الدین کی عظمت کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کی ہے اور انھیں اپنے عہد کے ہندوستانی علماء میں ایک خاص مقام کا حامل بتایا ہے۔ مثلاً حسب ذیل چار حضرات ان کے شاگردوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مولانا محبوب علی، مولانا فضل امام خیر آبادی، مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا محمد علی گوپا موی مصنف کشاف اصطلاحات الفنون۔ ڈاکٹر مشیر الحق کہتے ہیں کہ ان حضرات میں سے کسی کا مولانا منوّر الدین کا شاگرد ہونا ممکن نہیں ہے۔ مولانا محبوب علی (۱۲۰۰ھ تا ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء تا ۱۸۶۳ء) مولانا منور الدین سے دو سال بڑے تھے، اور سر سید احمد خان کے تذکرۂ اہل دہلی (مشمولہ آثار الصنادید) کے مطابق انھوں نے شاہ عبد العزیز

کے خاندان کے علماء سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا فضل امام خیرآبادی جو بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے دہلی کے صدر الصدور ہوئے اس وقت مفتی تھے جب منور الدّین بحیثیت طالب علم دہلی پہنچے۔ تیسرے "شاگرد" مولانا فضل رسول بدایونی نے دہلی میں تعلیم ہی نہیں حاصل کی بلکہ تذکرۂ علماء ہند (رحمٰن علی) کے مطابق وہ فرنگی محل (لکھنؤ) کے فارغ التحصیل تھے۔ آخری بزرگ مولانا محمد علی گوپامئوی کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ حقائق سامنے لائے گئے ہیں۔ کشاف اصطلاحات الفنون کے مصنف کا نام محمد علی نہیں بلکہ محمد اعلیٰ تھا۔ وہ گوپامئو (نزد لکھنؤ) کے نہیں بلکہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (نزد دہلی) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے چار جلدوں میں اپنی "کشاف..." ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء یعنی منور الدّین کی پیدائش سے بیالیس سال پہلے مرتب کی تھی۔

مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین (۱۸۳۱ء تا ۱۹۰۸ء) کے حالاتِ زندگی کے بیان میں بھی ایسی ہی لغزشیں پائی جاتی ہیں۔ مولانا خیر الدّین کی کمسنی ہی میں ان کے والد محمد ہادی کا انتقال ہو گیا لہٰذا ان کی تربیت مولانا منور الدّین نے کی۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا خیر الدین نے ممتاز علماء سے تعلیم حاصل کی۔ مثلاً مولانا فضل امام، مولانا رشید الدّین دہلوی مناظرہ کی ایک کتاب "رشیدیہ" کے مصنف اور مولانا محمد یعقوب۔ یہ تینوں حضرات اپنے اپنے فن کے امام تھے لیکن ڈاکٹر مشیر الحق کہتے ہیں کہ یہ سارا بیان اغلاط سے پُر ہے۔ مولانا فضل امام کا انتقال ۱۸۲۹ء میں یعنی خیر الدّین کی پیدائش سے دو سال پہلے ہو گیا تھا۔ مولانا رشید الدّین کا انتقال ۱۸۳۳ء میں ہوا جب خیر الدّین کی عمر دو سال تھی۔ لطف یہ کہ 'رشیدیہ' ان کی نہیں بلکہ مولانا عبد الرشید جونپوری کی تصنیف ہے جن کا انتقال ۱۶۷۲ء میں ہوا۔ مولانا محمد یعقوب ۱۸۴۰ء میں مکّہ چلے گئے تھے اور وہیں ۱۸۶۷ء میں انھوں نے وفات پائی۔ ان کی ہجرتِ مکّہ کے وقت خیر الدّین کی عمر دس سال بھی نہیں تھی۔ لیکن چونکہ خیر الدّین بھی ۱۸۵۷ء میں مکّہ ہجرت کر گئے تھے لہٰذا ممکن ہے وہاں انھوں نے مولانا یعقوب سے تعلیم حاصل کی ہو۔

۱۸۵۷ء کے لگ بھگ مولانا منور الدّین کے ساتھ مولانا خیر الدّین بھی ہندوستان سے مکّہ چلے گئے۔ مولانا منوّر الدّین کے مکّہ جانے میں بھی مختلف سوانح نگاروں کے بیان میں تضاد موجود ہے۔ بہر حال مولانا آزاد کہتے ہیں کہ مکّہ میں ان کے والد مولانا خیر الدین نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے ایک ہندوستان کے (نام نہاد) وہابیوں کے عقائد سے متعلق دس جلدوں میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر مشیر الحق نے ان

بہت سی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جن میں ان تمام عرب یا غیر عرب مصنفین کے حالات درج ہیں جن کی کوئی کتاب عربی میں شائع ہوئی لیکن ان میں سے کسی کتاب میں مولانا خیر الدّین کے حالات نہیں ملتے۔ صرف ایک جگہ ایک کتاب کا ذکر ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلاف کے عقائد سے متعلق ہے۔ اس کتاب کے مصنف کا نام محمد خیر الدّین خان (عرف خیوری) ہے۔

خود مولانا آزاد کے متعلق بھی کئی دلچسپ باتیں ڈاکٹر مشیر الحق کی کتاب میں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً مہادیو ڈیسائی نے پہلی بار اپنی کتاب میں یہ بیان کیا کہ ۱۹۰۵ء میں مولانا آزاد کو ان کے والد نے اپنے خرچ پر عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامعہ ازہر (مصر) بھیجا تھا۔ یہ بیان بار بار مولانا کے مختلف سوانح نگار دہراتے رہے کچھ لوگوں نے اس بیان کو غلط بھی کہا لیکن خود مولانا اس پورے عرصہ میں خاموش بیٹھے رہے چنانچہ عام طور سے لوگ اس بیان کو سچ ماننے لگے حتیٰ کہ مولانا کے انتقال کے موقع پر ہندوستانی پارلیمنٹ میں ان کی یاد میں جو سرکاری تجاویز منظور ہوئیں ان میں بھی یہی بات دہرائی گئی لیکن دوسرے دن وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو پارلیمنٹ کے سامنے اس غلطی کا اعتراف اور یہ اعلان کرنا پڑا کہ مولانا نے الازہر یونیورسٹی میں کبھی تعلیم حاصل نہیں کی۔ مولانا کے انتقال کے بعد ہمایوں کبیر کی انڈیا ونز فریڈم شائع ہوئی تو اس میں پہلی بار مولانا کی طرف یہ بیان منسوب تھا کہ مہادیو ڈیسائی نے مولانا کے بیان کو غلط سمجھ لیا تھا ورنہ مولانا نے ڈیسائی سے صرف یہ کہا تھا کہ ایک بار وہ الازہر دیکھنے گئے تھے۔ (ش - م - ف)

صدائے اسلام

ماہنامہ "صدائے اسلام" کا شمارہ نمبر ۸ - ۹ بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۷۰ء تبصرے میں اس وقت پیشِ نظر ہے۔ یہ ماہنامہ دار العلوم جامعہ اشرفیہ پشاور سے محمد اشرف علی قریشی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ جامعہ کے مہتمم مولانا محمد یوسف صاحب قریشی اس کے سرپرست ہیں۔

تعلیم کے ذریعے دینی مدارس نے اسلام کی جو خدمت انجام دی ہے اس کا اعتراف جہل یا بُخل کی وجہ سے نہ کیا جائے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ آج مسلمانوں میں دین کی جو رمق باقی ہے وہ انہی کا فیضان ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت جس طرح باطل کی قوتیں شمعِ الٰہی کو بجھانے کے درپے تھیں۔ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم، آج بھی لادینی عناصر اسلام کے خلاف صف آراء ہیں۔ ہر سو فتنوں کا زور ہے۔ دینی اقدار کی پامالی خود اہلِ اسلام کا شیوہ بن چکی ہے۔ ان حالات میں

ہمارے عربی مدارس اپنی سی کوشش کر رہے ہیں کہ جیسے تیسے ارشاد و تبلیغ کا حق ادا کرتے رہیں ان کی کوششیں ناکافی اور لبسا اوقات ناقص سہی، پھر بھی غنیمت ہے کہ وہ کچھ کر تو رہے ہیں۔ اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام کا نام باقی ہے۔

خوش آئند امر یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس اور ان کے چلانے والے علماء تقاضائے وقت کا اشارہ سمجھ کر حتی المقدور نشر و اشاعت کے اس اہم ترین ذریعہ صحافت اور جریدہ نگاری کی طرف بھی متوجہ ہیں، اور اس سے کام لینے کا احساس ان میں موجود ہے۔ آج ملک میں ایسے ممتاز اداروں کی تعداد درخور اعتنا کہی جا سکتی ہے جو درس و تدریس کی عام سرگرمیوں کے ساتھ قلم کا مورچہ بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ انہی میں ایک قابلِ ذکر ادارہ جامعہ اشرفیہ پشاور بھی ہے۔ ان اداروں سے ہفتہ وار یا ماہانہ جرائد کا اجراء دو طرفہ فائدے کا حامل ہے۔ ایک طرف یہ ادارے ان جرائد کے ذریعے اپنے طلبہ، قدیم و جدید، سے ربط و تعلق قائم رکھتے ہیں جو وحدتِ فکر و عمل اور استقامت کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ دوسری طرف عامۃ المسلمین کو پڑھنے کے لئے اسلامی تعلیمات اور دینی علوم پر مشتمل پاکیزہ لٹریچر فراہم کرتے ہیں۔ وسائل کی کمی اور حالات کی نامساعدت کے باوجود عربی مدارس کا اپنے مشن کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل رہنا قابلِ دید و قابلِ داد ہے۔ سادگی ہمارے دینی اداروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے کسی دینی درس گاہ سے نکلنے والے ایک رسالے میں ٹیپ ٹاپ یا ظاہری سج دھج کی تلاش بے سود ہے۔ عمدہ کاغذ، آفسٹ طباعت اور دیدہ زیب سرورق کا اہتمام کر کے وہ ذوقِ نظر کا سامان نہیں کر سکتا، مگر قلب و روح کے لئے اس میں بہت کچھ ہوتا ہے۔

صدائے اسلام بڑی تقطیع کے ۵۶ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے مضامین مفید اور معلوماتی ہوتے ہیں، تنقید کا انداز بے باکانہ ہے۔ اسے پڑھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے علماء بسم اللہ کے گنبد میں رہتے ہیں۔ علماء ملک و ملت کے مسائل سے اسی طرح باخبر ہیں جس طرح کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ، انھیں منزل کا پتا ہے اور راستے کے نشیب و فراز سے بھی واقف ہیں۔

چندہ سالانہ ۷ روپے، قیمت فی پرچہ ۷۰ پیسے۔ (ادارہ)